© rasailojaraid.com

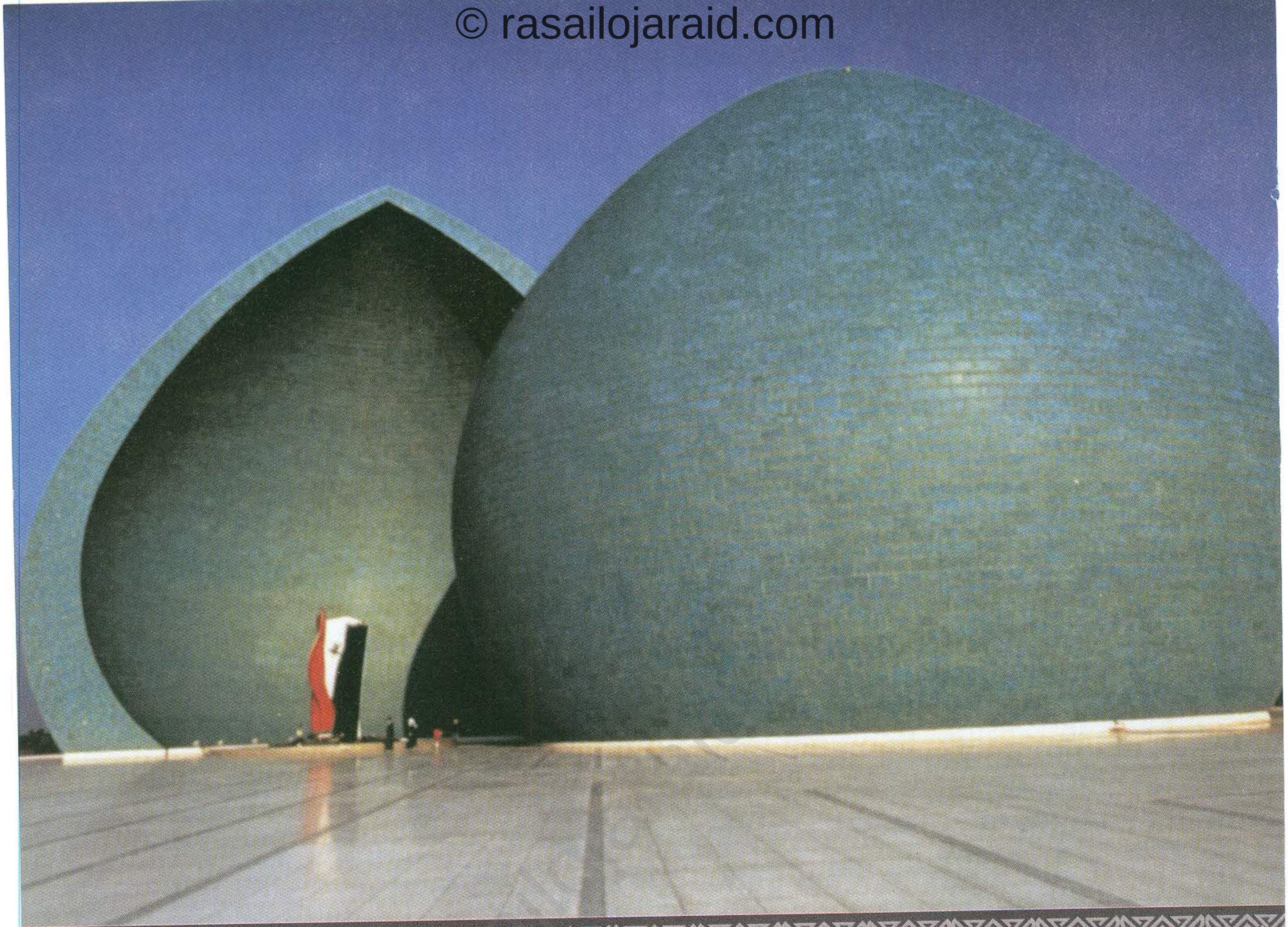

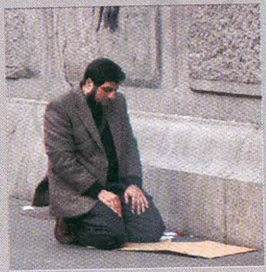

فكر دوران

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علم و ہنر کے ساتھ تہذیبی مظاہر تک،
بے شمار چیزیں مغرب سے آئیں۔ ان
میں سے کیا قبول کیا جائے اور کسے
مسترد کیا جائے، اس کا کوئی واضح
جواب نہیں مل سکا۔ قبولیت اور عدم
قبولیت کا یہ عمل ایک ساتھ جاری ہے۔
اس راہ میں ہم کبھی ایک قدم آگے بڑھاتے
ہیں اور کبھی دو قدم پیچھے یا دو قدم
آگے اور ایک پیچھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تصادم

ایک غیر اسلامی تصور

اسلام اور مغرب کے موضوع پر ایک مذاکرے کی روداد

مسلمانوں کو درپیش عصری مسائل پر مذاکرے اب اسلامی نظریاتی کونسل کی ایک روایت بنتی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں ۱۶ راگست ۲۰۰۷ء کو جو نشست منعقد ہوئی، اس کے لیے ''اسلام اور مغرب'' کا موضوع منتخب کیا گیا تھا۔ جو صاحبانِ علم اس مذاکرہ میں شریک ہوئے، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱- ڈاکٹر مظفر محسن نقوی، رکن اسلامی نظریاتی کونسل

۲- ڈاکٹر طاہر امین، پروفیسر بین الاقوامی تعلقات، قائد اعظم یونیورسٹی

۳- محترمہ عارفہ زہرا سیدہ، چیئر پرسن، قومی کمیشن برائے وقار نسواں

۴- آغا مرتضیٰ، پویا، دانشور، سیاسی رہنما

۵- پروفیسر خورشید احمد، سینیٹر، نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان

۶- ڈاکٹر محمد خالد مسعود، چیئر مین اسلامی نظریاتی کونسل

شرکاء کو اس نشست کے انعقاد سے پہلے ایک سوالنامہ بھیجا گیا تھا، جس میں موضوع زیر بحث سے متعلق بعض متعین سوالات ترتیب دیے گئے تھے۔ یہ سوالنامہ اس روداد کے ساتھ الگ سے دیا جا رہا ہے۔ مہمان مدیر ''اجتہاد'' نے اس مذاکرے میں نظامت کے فرائض سرانجام دیے۔ ڈاکٹر محمد خالد مسعود نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے مغرب کے بارے میں اس مخمصے کا ذکر کیا، جس میں مسلمان امت، بالخصوص اسلامی تحریکیں مبتلا ہیں۔ علم وہنر کے ساتھ تہذیبی مظاہر تک، بے شمار چیزیں مغرب سے آئیں۔ ان میں سے کیا قبول کیا جائے اور کسے مسترد کیا جائے، اس کا کوئی واضح جواب نہیں مل سکا۔ قبولیت اور عدم قبولیت کا یہ عمل ایک ساتھ جاری ہے۔ اس راہ میں ہم کبھی ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں اور کبھی دو قدم پیچھے یا دو قدم آگے اور ایک پیچھے۔ اس پر مستزاد مغرب کا استعماری پہلو ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ردوقبول کا اختیار استعمال کیے بغیر ''پورے کے پورے مغرب میں داخل ہو جاؤ''۔ اس کے ساتھ مغرب میں یہ سوچ بھی موجود ہے کہ تہذیبی سفر میں مسلمان مغرب کا ساتھ نہیں دے سکتے کیونکہ وہ فکر وعمل دونوں میں پس ماندہ ہیں۔ دوسری طرف اس وقت مغرب کو جو تہذیبی وسیاسی غلبہ حاصل ہے، اس کے پیش نظر مسلمان مغرب کو پوری طرح نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ اس گھمبیر صورت حال میں مسلمانوں کو سوچنا ہوگا کہ مغرب کے ساتھ تعلقات کو کس نہج پر استوار کیا جائے اور اگر ہمیں ان کے ساتھ مکالمہ کرنا ہے تو اس کی صورت کیا ہو۔

ڈاکٹر خالد مسعود کی اس گفتگو نے بحث وتمحیص کے لیے بڑی حد تک ایک بنیاد فراہم کر دی۔ اسے آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر محسن نقوی نے اس مخمصہ کی تائید کی، جس کا ذکر ڈاکٹر خالد مسعود نے کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں اس صورت حال کا سامنا عباسیوں کے دور میں بھی ہوا، جب مسلمان معاشرہ یونانی فکر سے متاثر ہونا شروع ہوا۔ اس عہد میں مسلمانوں نے مغربی افکار تو لیے لیکن کلچر سے احتراز کیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ مغربی کلچر کے اثرات ہمارے معاشرے پر گہرے ہوتے جا رہے ہیں اور ہمیں اس بارے میں کوئی لائحہ عمل طے کرنا پڑے گا۔ انہوں نے مغرب کے ساتھ مکالمہ کی تائید کی، لیکن تہذیبوں کے تصادم کے اس تصور کو رد کیا جو پروفیسر ہنٹنگٹن نے اپنے مقالے میں ۱۹۹۳ء میں پہلی بار پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر محسن نقوی کا کہنا تھا کہ ہماری اپنی روایات ہیں، اس لیے ہم مغربی اقدار کو قبول نہیں کر سکتے۔

> علم وہنر کے ساتھ تہذیبی مظاہر تک، بے شمار چیزیں مغرب سے آئیں۔ ان میں سے کیا قبول کیا جائے اور کسے مسترد کیا جائے، اس کا کوئی واضح جواب نہیں مل سکا۔

ڈاکٹر طاہر امین نے بھی تہذیبوں کے تصادم کے تصور کا ذکر کیا، تاہم انہوں نے اسے اسلام اور مغرب کے باہمی تعلقات کے وسیع تر تناظر میں دیکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ نوآبادیاتی دور کے بعد بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ کے ضمن میں جو نظام ہائے فکر سامنے آئے، انہیں اگر پیش نظر رکھا جائے تو اسلام اور مغرب کے باہمی تعلقات کو سمجھنے کے لیے مسلمان اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اگرچہ ابھی تک انہیں سمجھنے کی کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱- مغرب آپ کے نزدیک ایک جغرافیائی وحدت ہے، تہذیب ہے یا ایک سیاسی اکائی؟

۲- مغرب کے مطلوب انسان اور اسلام کے مطلوب انسان میں کیا فرق ہے؟

۳- اپنے تہذیبی تشخص میں کیا مغرب مذہب مخالف ہے؟

۴- مغرب کے اہل علم اسلام کے بارے میں یک زبان ہیں یا مختلف الخیال؟

۵- مغرب کے Multi Cultural تشخص میں اسلام کا کتنا حصہ ہے؟

۶- کیا اسلام اور مغرب کے مفادات باہم متصادم ہیں؟ اگر ہیں تو کس دائرے میں؟

۷- مغرب میں اسلام ایک چیلنج ہے یا ایک پھیلتا ہوا مذہب؟

۸- اسلام کی سیاسی تعبیر نے کیا مغرب کو تشویش میں مبتلا کیا ہے؟

۹- سلمان رشدی کا خطاب اور پھر ڈینش کارٹون جیسے واقعات مغرب میں کیوں ہوتے ہیں؟

۱۰- اسلام کے حوالے سے مغربی میڈیا کا عمومی کردار کیا ہے؟

۱۱- امریکا کے سیاسی مفادات کس حد تک اسلام اور مغرب کے تعلق پر اثر انداز ہو رہے ہیں؟

سنجیدہ کوشش سامنے نہیں آئی۔ ڈاکٹر طاہر امین کے نزدیک یہ نظام ہائے فکر پانچ ہیں:

۱- اختتام تاریخ کا تصور (End of History)

۲- تہذیبوں کا تصادم (Clash of Civilizations)

۳- باہمی انحصار کا پیچیدہ عمل (Complexion of Interdependence)

۴- مراکز قوت وتاثر کی کثرت (Multipolarity)

۵- مجرمانہ لاقانونیت (Criminal Anarchy)

پہلے چار تصورات کے مطابق اسلام مغرب کے لیے ایک چیلنج اور خطرہ ہے۔ جبکہ پانچواں پیراڈائم اسلام کو ایک سماجی عامل کے طور پر دیکھتا ہے۔ گویا ڈاکٹر طاہر امین کے نزدیک مغرب میں اسلام کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے اس نقطہ نظر کو بھی غلط قرار دیا، جس کے تحت مغرب کو ایک اکائی

> ہمیں مغرب کے ساتھ مثبت رابطے کو فروغ دینا چاہیئے اور اس کا سب سے بہتر طریقہ مکالمہ ہے۔ ہمیں تصادم کے بجائے عالم اسلام اور مغرب کے مابین رابطے کے عمل کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

کے طور پر لیا جاتا ہے۔ مغرب کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے وقت، ڈاکٹر طاہر امین کے الفاظ میں، ہمیں یہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ وہاں اسلام کے بارے میں ایک نہیں کئی نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں، اس لیے یہ انداز فکر درست نہیں، جس کے مطابق مغرب کو ایک وجود مان کر رائے قائم کی جاتی ہے۔ اسی طرح عالم اسلام بھی فکری اعتبار سے ایک اکائی نہیں ہے۔ اگر کوئی اسامہ بن لادن کو، مثال کے طور پر، پورے عالم اسلام کا واحد نمائندہ قرار دیتا ہے تو یہ غلط ہوگا۔

ڈاکٹر طاہر امین نے ایک اور اہم بات یہ کہی کہ مغرب ایک نئی حکمت عملی کے تحت دنیا پر ایک اداراتی تسلط (Institutional Hegemony) قائم کرنا چاہتا ہے۔ ماضی کی سامراجی قوتوں کی طرح دوسرے ملکوں پر فوجی چڑھائی اور ان پر قبضہ اس حکمت عملی کا حصہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عراق پر امریکی حملہ اور قبضہ مغرب میں تنقید کا شدید نشانہ بنا کیونکہ یہ اداراتی تسلط کے بنیادی تصور کے خلاف تھا اور اسے بش انتظامیہ کی کوتاہ بینی اور کم نظری پر محمول کیا گیا۔ اپنے اس بنیادی تجزیہ کی روشنی میں ڈاکٹر طاہر امین کا خیال تھا کہ ہمیں مغرب کے ساتھ مثبت رابطے کو فروغ دینا چاہیئے اور اس کا سب سے بہتر طریقہ مکالمہ ہے۔ ہمیں تصادم کے بجائے عالم اسلام اور مغرب کے مابین رابطے کے عمل کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے اور یہی اس وقت ہمارے مفاد میں ہے۔ آج ایک عالمی دنیا وجود میں آچکی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی معاشرہ دنیا سے کٹ کر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔

محترمہ عارفہ سیدہ کا کہنا تھا کہ مسلمان معاشروں میں ایک بنیادی غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ مغربیت اور جدیدیت ہم معنی ہیں، جب کہ حقیقت میں یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ تہذیب اور علم کے بارے میں بھی ہمارا رویہ اصلاح طلب ہے۔ تہذیب دراصل ایک جنت گم گشتہ کی تلاش ہے اور علم جستجو کا نام ہے۔ ہم دونوں تصورات سے دور ہیں۔

اسلام اور مغرب کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے حوالے سے محترمہ عارفہ سید خود احتسابی کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بعض بنیادی تصورات پر اگر نظرِ ثانی کریں تو ہم اس تعلق کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمان بالعموم عربی تہذیب کو اسلامی تہذیب سمجھتے ہیں۔ اسلام اصلاً بعض اصولوں اور افکار کا نام ہے۔ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ کسی بھی خطہ میں رہنے والے اسے بطور دین اختیار کر سکتے ہیں اور ان کے اپنے تہذیبی پس منظر میں اسلام انہیں اجنبی معلوم نہیں ہوتا۔ جب ہم اسے ایک

> اخلاقی قدروں کو مستحکم کیے بغیر معاشرے پرسکون اور پرامن نہیں ہوسکتے۔ بدقسمتی سے نہ مشرق کی اس بنیادی حقیقت پر نظر ہے نہ مغرب کی۔ آج شرق وغرب میں مصلحتوں کے ساتھ ترجیحات بدل جاتی ہیں۔

مخصوص خطے کی تہذیب سے متعلق کر دیتے ہیں، تو پھر بعض ایسی چیزیں اسلام سے منسوب ہو جاتی ہیں، جن کا تعلق مذہب سے نہیں، ایک خاص علاقے کی تہذیب سے ہوتا ہے۔ اسی طرح مسلمان معاشروں میں ترقی کا مفہوم بھی متعین اور واضح نہیں ہے۔ ہر نئی بات کو اچھوت قرار دیا جاتا ہے اور ہمیشہ قدیم کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہماری بنیاد وہی ہے، جو چودہ سو سال پہلے رکھی گئی، لیکن ہمیں اس بنیاد پر جو عمارت کھڑی کرنی ہے، اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ بنیاد پر اصرار اور عمارت کی تعمیر سے گریز ایک غیر متوازن اندازِ فکر ہے۔

ڈاکٹر عارفہ سیدہ نے یہ توجہ بھی دلائی کہ زندگی کی بنیاد اخلاق پر ہے۔ اخلاقی قدروں کو مستحکم کیے بغیر معاشرے پرسکون اور پرامن نہیں ہوسکتے۔ بدقسمتی سے نہ مشرق کی اس بنیادی حقیقت پر نظر ہے نہ مغرب کی۔ آج شرق وغرب میں مصلحتوں کے ساتھ ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے بش انتظامیہ کی موجودہ حکمت عملی کو بطور مثال پیش کیا، جو ان کے نزدیک صدر بش کے احساس کمتری کا بدترین مظہر ہے۔ تصادم کو انہوں نے غلط اور مسلمانوں کے لیے نقصان دہ قرار دیا۔ ڈاکٹر عارفہ سید نے بھی مغرب اور عالم اسلام کے مابین مکالمے اور رابطے کی تائید کی۔

آغا مرتضیٰ پویا کا کہنا تھا کہ اسلام اور مغرب میں تصادم ناگزیر ہے اور اس کی ایک بنیادی وجہ ہے۔ اسلام آج الہامی علم و ہدایت کا نمائندہ ہے جبکہ مغرب سیکولرزم کا۔ یہ دونوں زندگی کے بارے میں دو متضاد نقطہ ہائے نظر ہیں، اس لیے ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ مغرب آج اسلام کو مٹانے کے درپے ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے جو حکمت عملی اپنائی ہے، اس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ ہم مسلمانوں کو عیسائی تو نہیں بنا سکتے لیکن اس کی پوری کوشش کرنی چاہئے کہ مسلمان مسلمان بھی نہ رہیں۔ انہوں نے اس تصور کی تائید نہیں کی کہ مغرب ایک اکائی نہیں ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اظہار کے اسالیب مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن اسلام دشمنی کے معاملہ میں مغرب ایک وحدت کا نام ہے۔ جناب مرتضیٰ پویا نے پاکستان کی جماعت اسلامی اور مصر کی الاخوان المسلمون کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ عالم اسلام کی یہ تحریکیں اسی مغربی سازش کو روکنے کے لیے اٹھی تھیں۔

مغرب کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ وہ کسی اخلاقی بنیاد پر یقین نہیں رکھتا۔ انہوں نے اپنے استعماری عزائم کے لیے دو عالمی جنگوں میں ایک سو ملین انسانوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ اب اسلام اور مسلمان ان کا ہدف ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے فلسطین کی مثال بھی دی۔ ان کا کہنا تھا کہ مغرب کی یہ ساری تگ و دو ایک صیہونی ریاست، اسرائیل کو بچانے کے لیے ہے۔ چنانچہ جب ڈیگال نے ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کی مخالفت کی تو چند ماہ بعد اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ تاہم ان کا کہنا تھا کہ مغرب کی ان تمام کوششوں کے باوجود یہ صیہونی ریاست اب قائم نہیں رہ سکتی۔ خود اسرائیل کے اندر سے اس کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں اور اسے ایک غیر اخلاقی ریاست قرار دیا جا رہا ہے۔

ان کی رائے یہ تھی کہ مغرب عالم اسلام پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا ہے اور دنیا کو ایک نئے اقداری نظام کا پابند بنانا چاہتا ہے۔ بطور دلیل انہوں نے امریکا کے سابق صدر نکسن کے ۳۵ صفحات پر مشتمل ایک خط کا حوالہ دیا، جس میں انہوں ۱۹۸۵ء میں روس کے صدر کو لکھا تھا کہ دونوں کو مل کر اسلام کو روکنے پر پوری توجہ مرتکز کرنی چاہئے۔ آغا صاحب کے نزدیک مغرب کسی بین الاقوامی قانون کو نہیں مانتا۔ اسے اس بات کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ افغانستان میں طالبان حکومت کو ختم کرتا۔ اسی طرح مغرب دنیا میں جو اقداری نظام متعارف کرانا چاہتا ہے وہ الہامی علم کی نفی پر کھڑا ہے۔ مغرب میں عیسائی اگر اچھے عیسائی بن جائیں اور یہودی اچھے یہودی بن جائیں تو اس میں سب

کے لیے خیر ہے اور ہم یہی چاہتے ہیں لیکن اس نئے اقداری نظام کے تحت ایسا ممکن نہیں ہے۔ انہوں اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ عالم اسلام میں حکمران مغرب سے ہدایات لیتے ہیں۔ آغا مرتضیٰ پویا کے نزدیک مسلمانوں کا مطمع نظر رضائے الٰہی ہونا چاہئے اور دنیاوی نتائج کو اس حوالے سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔ آغا صاحب کا اصرار تھا کہ موجودہ تصادم کی کیفیت مسلمانوں پر مسلط کی گئی ہے اور ان کے پاس اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ اس کا سامنا کریں۔ سینیٹر پروفیسر خورشید احمد نے اپنی گفتگو کے آغاز میں اس رائے کی تائید کی کہ مغرب کو ایک اکائی نہیں سمجھنا چاہئے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہاں موجود آراء کے تنوع کو پیش نظر رکھنا چاہیے، تاہم ان کا خیال تھا کہ اس رائے کو اس تحفظ کے ساتھ قبول کرنا چاہیے کہ اس وقت دو مختلف تہذیبی نظام ہائے فکر موجود ہیں، یعنی الہامی اور غیر الہامی۔ اس اعتبار سے دونوں اپنی اپنی جگہ ایک اکائی ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد صاحب نے موضوع زیر بحث کے حوالے سے جن دیگر پہلوؤں کو نمایاں کیا، انہیں ہم نکات کی صورت میں کچھ اس طرح بیان کر سکتے ہیں:

☆ ''مغرب'' کو ایک جغرافی وحدت سمجھنا درست نہیں۔ یہ اصلاً ایک اسلوب زندگی کا عنوان ہے۔ اسی طرح اسلام اپنے پیغام میں عالمگیر ہے، تاہم اسلام کو

"مغرب" کو ایک جغرافی وحدت سمجھنا درست نہیں۔ یہ اصلاً ایک اسلوب زندگی کا عنوان ہے۔ اسی طرح اسلام اپنے پیغام میں عالمگیر ہے، تاہم اسلام کو ایک عالمگیر قوت بننے کے لیے ایک جغرافی بنیاد چاہیے۔ لیکن اس کا پیغام بہرحال کسی جغرافیہ میں قید نہیں ہے۔

ایک عالمگیر قوت بننے کے لیے ایک جغرافی بنیاد چاہیے۔ لیکن اس کا پیغام بہرحال کسی جغرافیہ میں قید نہیں ہے۔

☆ مسلمانوں کو درپیش مسئلہ ہمہ جہتی ہے۔ یہ تہذیبی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ معاشی، سیاسی اور سماجی بھی ہے جس کا دائرہ فنون و آرٹ تک پھیلا ہوا ہے۔

☆ سیاسی غلبہ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ آج یہ امریکا کو حاصل ہے، کل یورپ کا غلبہ تھا اور اس سے پہلے ہم سیاسی طور پر غالب رہے۔ کوئی تجزیہ کرتے وقت ہم اس پہلو سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ جہاں تک موجودہ حالات کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج مغرب کو تہذیبی غلبہ حاصل ہے۔

☆ مسلمانوں کو منصب شہادت پر فائز کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں دنیا کے سامنے حق کی شہادت دینی ہے۔ یہ شہادت قولی بھی ہے اور عملی بھی۔ اس اعتبار سے مسلمان ایک داعی قوم ہے۔ دیگر اقوام کے ساتھ اس کا تعلق داعی اور مدعو کا ہے۔ جب مسلمان ایک صاحب دعوت قوم ہے تو پھر کوئی قوم اس کی دشمن نہیں ہو سکتی۔

☆ تصادم ایک غیر اسلامی تصور ہے۔ دیگر اقوام کے ساتھ ہمارے تعلق کی صحیح اساس مکالمہ ہے۔ مکالمہ، دعوت اور پھر اس راہ میں فطری طریقے پر مسابقت بھی ہوگی، جس کے نتیجے میں تصادم کا امکان بھی ہے، لیکن ہم اس سے گریز کریں گے اور اس میں نہیں الجھیں گے۔

☆ مغرب سے مکالمہ کرتے وقت اسے سمجھنا ضروری ہے۔ مغرب میں ''ہم کون ہیں؟'' (Who are We?) جیسی کتابیں لکھی جا رہی ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امریکی خود کو ایونجلیکل عیسائی سمجھتے ہیں۔ مغرب کو سمجھنے کے لیے اس بات کو بنیاد بنانا چاہیے۔ (یہ پروٹسٹنٹ عیسائیوں کا وہ گروہ ہے جو دوسروں کو عیسائی بنانے کی تبلیغ کرتا ہے اور اس کے افراد تبلیغ عیسائیت کے لیے ساری دنیا میں متحرک رہتے ہیں)۔

☆ مغرب کی ایک استعماری تاریخ اور نفسیات ہے، جس کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ یونانی فلسفہ انسانی غلامی کو قبول کرتا ہے اور اس میں نوآبادیاتی ذہنیت کارفرما رہی ہے۔ یہی معاملہ سلطنت کا تھا۔ پھر ہمارے سامنے بعد از نشأۃ ثانیہ (Post-Renaissance) ماڈل ہے۔ اس کے بعد دنیا نے روس اور امریکا کا غلبہ دیکھا اور آج صرف امریکی غلبہ ہے۔ ہر سپر پاور اپنا عالمی تسلط قائم کرنا چاہتی ہے۔ برطانوی استعمار کا کہنا تھا ''ہم لہروں پر حکومت کرتے ہیں''۔

☆ اسلام طاقت بمعنی سیاسی قوت کے حصول کو ایک آلے کے طور پر ضروری سمجھتا ہے، تاہم طاقت اس کا مقصود نہیں ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ اسلام میں اصلاً اہمیت اللہ سے تعلق کی ہے۔

☆ مغرب کے لیے اسلامی بنیاد پرستی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ اسلام ہے۔ ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب میں واضح کیا ہے کہ اسلام اصل مسئلہ اس لیے ہے کہ مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک طرف وہ برتر نظام زندگی رکھتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ طاقت سے محروم ہیں، جس سے ان کے اندر کمزور ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

پروفیسر خورشید احمد نے ہنٹنگٹن کی جس بات کا حوالہ دیا ہے وہ ان کے الفاظ میں کچھ اس طرح بیان ہوئی ہے:

The underlying problem for the West is not Islamic fundamentalism. It is Islam, a different civilization whose people are convinced of the superiority of their culture and are obsessed with the inferiority of their power. The problem for Islam is not the CIA or the U.S. Department of Defense. It is the West, a different civilization whose people are convinced of the universality of their culture and believe that their superior, if declining, power imposes on them the obligation to extend that culture throughout the world. These are the basic ingredients that fuel conflict between Islam and the West.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(مغرب کے لیے بنیادی مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں ہے، یہ مسئلہ ایک مختلف تہذیب اسلام ہے، جس کے ماننے والے اپنی تمدنی برتری کے قائل ہیں لیکن اس کے ساتھ اپنی قوت کی کمتری کے احساس میں بھی مبتلا ہیں۔ اسلام کا مسئلہ سی آئی اے یا امریکا کا محکمہ دفاع نہیں ہے، یہ مغرب ہے، جو ایک مختلف تہذیب ہے اور جس کے ماننے والے اپنے تمدن کی عالمگیریت کے قائل ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ ان کی برتر قوت، جواگرچہ زوال پذیر ہے، ان پر ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ وہ اپنے کلچر کو ساری دنیا میں پھیلائیں۔ یہ وہ بنیادی اسباب ہیں جو اسلام اور مغرب کے اختلاف کے حوالے سے جلتی پر تیل کے مترادف ہیں۔)

☆ مسلمانوں کے لیے بھی اصل مسئلہ مغرب ہے، جو آج ایک تہذیب ہی نہیں ایک عسکری قوت ہے اور جو سیاسی بنیاد پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہ بات مسلمانوں کے سوچنے کی ہے۔

☆ اسلام کسی تسلط اور زبردستی کا قائل نہیں۔ اللہ انسان کا خالق ہے۔ لیکن اس کے باوجود، اسلام کے نزدیک انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ چاہے تو اس حقیقت کا انکار کردے۔ تصادم وہاں سے شروع ہوتا ہے، جب کوئی گروہ اپنی بات دوسرے پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔

مغرب میں سائنس کی برتری ہے۔ مسلمان اگر ترقی کرتے تو شاید انسانیت کو درپیش مذہب اور سائنس کا یہ تصادم ختم ہوسکتا تھا۔ اسلام اور مغرب میں دعویٰ (Thesis) اور جواب دعویٰ (Anti Thesis) کی نسبت ہے۔

☆ موجود حالات گہرے سوچ بچار کے متقاضی ہیں۔ تصادم نقصان دہ اور غلط ہے، لیکن بعض اوقات حالات انسان کو اس پر مجبور کردیتے ہیں۔ ایسے طریقے اختیار کرنا غلط ہے، جس سے تہذیب کو خطرہ لاحق ہو۔ تاہم یہ بات اہل مغرب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دہشت گردی ظلم کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات ہنٹنگٹن نے بھی لکھی کہ دہشت گردی طاقت ور کے خلاف کمزور کا ہتھیار ہے (Terrorism is the weapon against the powerful)۔ اسی طرح مغرب میں ایسی کتابیں لکھی جارہی ہیں، جن میں اس حقیقت کو مانا گیا ہے کہ خودکش حملے یا دہشت گردی ظلم کی پیداوار ہیں، جیسے ''جیت کے لیے مرنا'' (Dying to Win) یا ''میرا جسم میرا ہتھیار'' (My Body My Weapon)۔

☆ یورپی یونین اصل میں عیسائی کلب ہے۔ افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے بعد اسلامی بنیاد پرستی مغرب کا ہدف ہے۔

☆ اگر ہمیں مقابلہ کرنا ہے تو اس کے لیے قوت ضروری ہے۔ ہمیں مزاحمت اور سد جارحیت دونوں کی ضرورت ہے۔ یہ مرحلہ تیاری کا ہے۔ تصادم اگر ہم پر مسلط کیا جائے تو بھی ہمیں اس سے بچنا چاہیے، تاہم ہمیں شکست کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اللہ کے فضل سے ایک قوت ہیں اور ہمیں اس کا بھی احساس ہونا چاہیے۔ ہمیں معذرت خواہانہ رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ حماقت اور خود پسندی سے بچنا چاہیے۔ دشمن کے نقشے کے مطابق جنگ میں کودنا حماقت ہے۔

☆ ہمارا مسئلہ صرف مغرب نہیں بلکہ داخلی مسائل بھی ہیں۔ ہمیں اپنی تعمیر پر توجہ دینی ہوگی۔ اس کے لیے تین کام ضروری ہیں:

۱- اخلاق کی بنیاد پر ریاست، معاشرہ اور فرد کی تعمیر۔

۲- علم اور ٹیکنالوجی میں درک پیدا کرنا۔ رسالت مآب ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، اس میں اللہ کے ساتھ تعلق، علم اور ٹیکنالوجی، تینوں کا ایک ساتھ ذکر ہے۔

۳- تہذیب کی تشکیل۔ اس کا دائرہ اخلاق، رسم و رواج، سیاست، ادارے اور فنون پر محیط ہے۔ اسی طرح اس کی تشکیل میں جغرافیہ، موسم، تاریخ کے ساتھ اقدار اور ایمان کا بھی اپنا کردار ہے۔ تہذیب شناخت ہوتی ہے اور یہی شناخت ہمارا بڑا مسئلہ ہے۔

☆ اخلاقی قوت کی اہمیت کو بھی اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ اخلاقی قوت کسی طرح بھی مادی قوت سے کم اہم نہیں ہے۔

☆ اسلام میں پورا داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ رویہ منافقانہ نہ ہو۔

پروفیسر خورشید احمد صاحب کے مفصل خطاب کے بعد سوال و جواب اور تبصروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر طاہر امین نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے اصلاح احوال کے حوالے سے تین اہم باتیں کہیں:

۱- اس وقت امت مسلمہ کا سب سے بڑا بحران فکری ہے۔ نئی نسل کو صحیح راہنمائی میسر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہے اور قوم ایک فکری انتشار میں مبتلا ہے۔ اس انتشار کے سبب ہم اپنی نئی نسل کو تیزی سے کھوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر امین نے اس ضمن میں انٹرنیٹ کی ایک گفتگو کا حوالہ دیا، جس میں ایک طالب علم نے کسی سے پوچھا ''مولانا مودودی کون تھے؟'' جواباً جو کچھ بتایا گیا وہ لاعلمی کا ایک شاہکار تھا، جس سے بجائے سوال کا جواب ملنے کے، اس طالب علم کی فکری پراگندگی میں مزید اضافہ ہوا۔ انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل کی ان کوششوں کا خیر مقدم کیا، جن کے تحت قوم اور ملت کو درپیش مسائل کو ایک کھلے ماحول میں زیر بحث لایا جا

اسلام اور مغرب میں تصادم ناگزیر ہے اور اس کی ایک بنیادی وجہ ہے۔ اسلام آج الہامی علم وہدایت کا نمائندہ ہے جبکہ مغرب سیکولرزم کا۔ یہ دونوں زندگی کے بارے میں دو متضاد نقطہ ہائے نظر ہیں، اس لیے ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔

رہا ہے۔ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس طرح کے فورمز تعلیمی اداروں میں اور معاشرے میں تسلسل کے ساتھ منعقد ہونے چاہئیں۔ یہ بحث ومباحثہ کی مجالس اس لیے ضروری ہیں کہ نوجوانوں میں بات چیت کا کلچر فروغ پائے کیونکہ ہم تشدد کے رجحانات کے باعث نئی نسل کو ضائع اور پامال کر رہے ہیں۔ آج ہمارے پاس ایسا لٹریچر موجود نہیں ہے، جو بین الاقوامی تعلقات اور اس نوعیت کے دیگر امور پر نئی نسل کی راہنمائی کر سکے۔

۲- پاکستان کے حوالے سے دیکھیے تو معاشرے اور ریاست کے مابین تصادم ہے۔ یہ تصادم گذشتہ آٹھ دس سال میں بہت نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔

۳- اصلاح احوال کے لیے ہمیں ایک ہمہ جہتی لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا، جو سیاست، معیشت اور سماج کے جملہ امور کو سامنے رکھتے ہوئے مرتب کیا گیا ہو۔ ڈاکٹر طاہر امین نے ایک انگریزی فلم کا حوالہ دیا، جس میں ایک حبشی مسلمان کو دکھایا گیا ہے، جو تلوار کے زبردست کمالات دکھاتا ہے۔ پھر ایک آدمی جدید سٹین گن کے ساتھ آتا ہے، تو اسے تمام کمالات کے ساتھ لمحہ میں ڈھیر کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ تھا کہ جدید دور میں جو تبدیلیاں آ چکی ہیں، ان سے صرف نظر مسلمانوں کے لیے شدید نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے دو باتوں کی طرف توجہ دلائی۔ ایک تو یہ کہ ہم خواہی نخواہی عالمگیریت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم اسے امکان سمجھنے کے بجائے خطرہ سمجھ رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس سوچ کو تبدیل کیا جائے۔ ڈاکٹر خالد مسعود کی اس بات کو بھارت کے ممتاز عالم دین مولانا وحید الدین خان نے اس طرح بیان کیا ہے کہ دنیا میں ہماری سیاسی سلطنت ختم ہو گئی، لیکن موجودہ حالات نے ہمارے لیے یہ مواقع فراہم کر دیے ہیں کہ ہم اپنی دعوہ ایمپائر ضرور کھڑی کر سکتے ہیں۔ دوسری اہم بات ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ تھی کہ ہم دنیا کو اچھا یا برا، غلط یا صحیح دو خانوں میں بانٹتے ہیں۔ یہ انداز فکر بھی اسلامی نہیں ہے۔ قرآن مجید دیگر مذاہب کو غلط نہیں کہتا، وہ یہ کہتا ہے کہ یہ مذاہب اصلاً درست تھے لیکن پھر غلط راستے پر چل پڑے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ تھا کہ ہمیں مغرب کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے اور اپنی اصلاح کا لائحہ عمل طے کرتے وقت ان دو باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ آج مسلمان معاشروں میں وہ فضا موجود نہیں ہے، جس میں ہم ایک ہمہ جہتی سوچ کو آگے بڑھا سکیں اور مذکورہ بالا دو نکات کی روشنی میں غور وفکر کر سکیں۔ ڈاکٹر محسن نقوی نے مغرب کے حوالے سے سائنس اور مذہب میں تصادم کی تاریخ کا حوالہ دیا اور یہ رائے دی کہ مغرب میں سائنس کی برتری ہے۔ مسلمان اگر ترقی کرتے تو شاید انسانیت کو درپیش مذہب اور سائنس کا یہ تصادم ختم ہو سکتا تھا۔ ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ اسلام اور مغرب میں دعویٰ (Thesis) اور جواب دعویٰ (Anti Thesis) کی نسبت ہے۔ ان کے خیال میں مسلمان معاشروں کے لیے جدید سوچ کی ضرورت ہے اور آنکھیں بند کر کے صرف ماضی کی طرف دیکھنا ہمارے مسائل کے حل کے لیے کافی نہیں۔

پروفیسر خورشید صاحب کا خیال تھا کہ ماضی کا مکمل رد ایک نازک مسئلہ ہے، جس پر سنجیدہ غور وفکر کی ضرورت ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے حالات مشکل ضرور ہیں لیکن مایوس کن نہیں۔ موجودہ حالات یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر درست جگہ پر کھڑا ہے۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ کمزور ہمیشہ کمزور نہیں رہتا اگر وہ اسے دل سے قبول نہ کرے۔ آج امید غالب ہے اور ہمیں مزاحمت اور سد جارحیت کے اصول پہ حکمت عملی اختیار کرنی چاہئیے۔ ریاست اور معاشرے کے تصادم کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ ریاست معاشرے کی تربیت کرتی ہے اور جواباً معاشرہ نگرانی کرتا ہے۔ یہ فکر انگیز نشست دو گھنٹے سے زائد جاری رہی۔ اس سے مکالمہ کا وہ عمل آگے بڑھا، جو آج ہمارے معاشرے کی ایک ناگزیر بنیادی ضرورت ہے۔ اگر مختلف نقطہ ہائے نظر کے حاملین یہ سوچ کر ایک جگہ بیٹھیں کہ وہ سب ایک امت کے رکن اور اس کے مفاد میں سوچتے ہوئے اختلاف کر رہے ہیں، تو اس سے معاشرے میں وہ صحت مند فکری ارتقا سامنے آئے گا، جو اس کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ یہ گفتگو اگرچہ اس سوالنامے کے عین مطابق تو نہیں ہوئی، جو معزز شرکاء کو ارسال کیا گیا تھا لیکن مختلف زاویوں سے وہ امور اس گفتگو میں زیر بحث آئے ہیں، جو سوالنامے میں اٹھائے گئے تھے۔ اہل علم نے جس طرح اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر اس موضوع پر سوچا اور پھر اظہار خیال کیا،

ڈاکٹر خالد مسعود نے اس پر ان کا شکریہ ادا کیا اور اسے ایک نیک شگون قرار دیا کہ ہمارے اہل علم ملت کو درپیش فکری مسائل پر غور وفکر کرنے اور ان کے حل کے متمنی ہیں۔

© rasailojaraid.com